ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 419

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :علم التعلیم • (419) سطح :بی اے

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 2 یونٹ 6 تا 9) کل نمبر100 :، کامیابی کے نمبر40 :

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کو غور سے پڑھیں، تصورات کو سمجھیں اور پھر جوابات اپنی سمجھ کے مطابق اپنے الفاظ میں لکھیں۔ یہی طریقہ امتحان میں بہتر نمبروں اور حقیقی سیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر :1 فلسفۂ تعلیم اور ذہنی و فکری نشوونما 20) نمبر(

سوال نمبر :1 فلسفۂ تعلیم ذہنی و فکری نشوونما میں کس طرح معاون ثابت ہوتا ہے؟ وضاحت کریں۔(20)

تعارف

تعلیم کے ہر عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی فلسفہ ضرور کام کرتا ہے، چاہے استاد کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ جب استاد پڑھاتا ہے تو وہ دراصل یہ طے کر رہا ہوتا ہے کہ کون سا علم اہم ہے، بچے کی فطرت کیا ہے، سیکھنا کیسے ہوتا ہے اور اچھا انسان کیسا ہوتا ہے؛ یہی بنیادی سوالات فلسفے کا میدان ہیں۔ فلسفۂ تعلیم سے مراد تعلیم کے مقاصد، نوعیت اور طریقوں پر منظم غور و فکر ہے جو فلسفے کے اصولوں کو تعلیمی مسائل پر منطبق کرتا ہے۔ دوسری طرف ذہنی و فکری نشوونما سے مراد بچے کی عقل، فہم، استدلال، تنقیدی سوچ، تخیل اور فیصلہ سازی کی صلاحیتوں کا تدریجی

ارتقا ہے۔ سوال یہ ہے کہ فلسفۂ تعلیم اس نشوونما میں کس طرح معاون ہوتا ہے۔ اس جواب میں پہلے دونوں تصورات کی وضاحت کی جائے گی اور پھر ان طریقوں کی تفصیل پیش کی جائے گی جن سے فلسفہ مقاصد کی تعیین، مواد کے انتخاب، تدریسی طریقوں اور استاد کے رویّے کے ذریعے بچے کے ذہن و فکر کو پروان چڑھاتا ہے۔

یہ موضوع اس لیے بھی اہم ہے کہ آج کی تعلیم اکثر فلسفیانہ سمت کے بغیر چل رہی ہے: نصاب معلومات سے بھرا ہے مگر سوچنے کی تربیت کم ہے، امتحانات یادداشت کو جانچتے ہیں مگر فہم کو نہیں۔ ایسی صورت میں فلسفۂ تعلیم کی طرف رجوع ہی وہ راستہ ہے جو تعلیم کو معلومات کی منتقلی سے نکال کر ذہن سازی کا عمل بنا سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، غزالی، ابن خلدون، روسو، پیسٹالوزی اور ڈیوی جیسے تمام بڑے ماہرینِ تعلیم دراصل فلسفی تھے، اور ان کی تعلیمی تجاویز ان کے فلسفے سے ہی نکلی تھیں۔

فلسفۂ تعلیم اور ذہنی نشوونما کا مفہوم

فلسفے کے تین بڑے شعبے تعلیم سے براہ راست متعلق ہیں۔ مابعد الطبیعیات یہ سوال اٹھاتی ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان و کائنات کی اصل کیا ہے؛ اس سے نصاب کے مواد کا فیصلہ ہوتا ہے کہ کیا پڑھانا ہے۔ علمیات یہ پوچھتی ہے کہ علم کیا ہے اور ہم کیسے جانتے ہیں؛ اس سے تدریسی طریقے نکلتے ہیں، یعنی بچہ کتاب سے سیکھتا ہے، مشاہدے سے یا عمل سے۔ اقداریات یہ طے کرتی ہے کہ اچھا اور درست کیا ہے؛ اس سے تعلیم کے اخلاقی مقاصد بنتے ہیں۔ فلسفۂ تعلیم ان تینوں کو ملا کر تعلیمی نظام کو سمت دیتا ہے۔ چار بڑے تعلیمی فلسفے خاص طور پر معروف ہیں: مثالیت پسندی) آئیڈیلزم (عقل و روح کی نشوونما اور ازلی سچائیوں پر زور دیتی ہے؛ حقیقت پسندی) رئیلزم (مشاہدے اور سائنسی علم کو بنیاد بناتی ہے؛ عملیت پسندی) پراگمیٹزم (تجربے، عمل اور مسئلہ حل کرنے کو اصل سیکھنا قرار دیتی ہے؛ اور فطرت پسندی بچے کی فطری نشوونما کو رہنما مانتی ہے۔ ہر فلسفہ ذہنی نشوونما کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

ذہنی و فکری نشوونما ایک مرحلہ وار عمل ہے۔ بچہ پیدائش کے بعد حواس سے سیکھتا ہے، پھر زبان کے ذریعے اشیا کو نام دیتا ہے، پھر مخصوص مثالوں سے عام اصول بناتا ہے اور نوعمری میں تجریدی استدلال، مفروضے قائم کرنا اور دور رس نتائج سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ پیاجے جیسے ماہرین نے اس کے باقاعدہ مراحل بیان کیے ہیں۔ اس نشوونما کے لیے محض معلومات کافی نہیں؛ ذہن کو سوال اٹھانے، موازنہ کرنے، دلیل دینے اور غلطی سے سیکھنے کے مواقع

چاہئیں۔ یہ مواقع کس طرح اور کس مقصد کے لیے دیے جائیں، اس کا فیصلہ فلسفۂ تعلیم ہی کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ تعلیم کی روح ہے اور ذہنی نشوونما اس کا ثمرہ۔

فلسفۂ تعلیم ذہنی و فکری نشوونما میں معاون کیسے ہوتا ہے؟

فلسفۂ تعلیم سب سے پہلے واضح مقاصد دے کر ذہنی نشوونما کی راہ متعین کرتا ہے۔ اگر مقصد ذہن کی تربیت ہے تو نصاب وہی مضامین اور سرگرمیاں رکھے گا جو استدلال، تجزیے اور تخلیق کو بڑھائیں؛ اگر مقصد صرف معلومات کا انبار ہے تو وہی نظام رٹے کو فروغ دے گا جو آج ہم دیکھتے ہیں۔ مقاصد کی وضاحت استاد اور طالب علم دونوں کو سمت دیتی ہے اور سیکھنے کے عمل کو بے مقصد مشقت کے بجائے بامقصد جدوجہد بنا دیتی ہے۔ دوم، فلسفہ تنقیدی سوچ پیدا کرتا ہے۔ سقراط کا مکالماتی طریقہ اس کی بہترین مثال ہے: سوال پر سوال کر کے طالب علم کو اپنی رائے کی جانچ پر مائل کرنا۔ جو تعلیم سوال کو دباتی ہے وہ ذہن کو قید کرتی ہے، جو تعلیم سوال کی حوصلہ افزائی کرتی ہے وہ ذہن کو آزاد کرتی ہے۔ فلسفہ استاد کو یہی سکھاتا ہے کہ بچے کا سوال تدریس کی رکاوٹ نہیں بلکہ اس کا آغاز ہے۔

سوم، فلسفہ استدلال اور منطق کی تربیت کا ذریعہ بنتا ہے۔ دلیل و برہان کی قدر و قیمت، مغالطوں کی پہچان اور ثبوت کے بغیر بات نہ ماننا وہ عادات ہیں جو ذہن کو پختہ کرتی ہیں۔ چہارم، فلسفہ نصاب کو منظم و مربوط بناتا ہے: یہ طے کرتا ہے کہ کس عمر میں کون سا علم کس ترتیب سے دیا جائے تاکہ ذہن مرحلہ وار آگے بڑھے، جیسا کہ ابن خلدون نے تدریج کے اصول میں کہا تھا۔ پنجم، عملیت پسند فلسفے نے کر کے سیکھنے (Learning by Doing) اور مسئلہ حل کرنے کے طریقے دیے جن سے ذہن فعال ہوتا ہے؛ طالب علم کتابی جواب کے بجائے حقیقی مسئلے سے نبرد آزما ہوتا ہے تو اس کی فکری صلاحیتیں ورزش پاتی ہیں۔ ششم، فلسفہ خود آگاہی دیتا ہے: طالب علم اپنے سیکھنے کے عمل کو سمجھنے لگتا ہے کہ وہ کیسے سوچتا ہے اور کہاں غلطی کرتا ہے، جسے جدید اصطلاح میں میٹاکاگنیشن کہتے ہیں۔ ہفتم، فلسفہ اقدار اور مقصدیت سے ذہن کو بڑے سوالات سے جوڑتا ہے — میں کون ہوں، زندگی کا مقصد کیا ہے — اور یہ بڑے سوالات ہی فکر کو گہرائی دیتے ہیں، ورنہ ذہن چھوٹے تکنیکی مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

کلاس روم کی سطح پر اس کے عملی مظاہر واضح ہیں۔ فلسفیانہ بنیاد رکھنے والا استاد سبق کو سوالات سے شروع کرتا ہے، مختلف آراء کو سامنے لاتا ہے، طالب علموں سے دلیل طلب کرتا ہے اور اختلافِ رائے کا احترام سکھاتا ہے۔ وہ جوابات کے بجائے سوچنے کے عمل کی قدر کرتا ہے اور امتحان میں بھی فہم و اطلاق کو جانچتا ہے۔ اس کے برعکس

فلسفے سے عاری تدریس میں استاد بولتا اور بچہ سنتا ہے؛ نتیجہ معلومات کا عارضی ذخیرہ ہوتا ہے جو امتحان کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ تحقیق بھی یہی بتاتی ہے کہ جن اسکولوں میں بحث و مکالمے، فلسفہ برائے بچے (Philosophy for Children) جیسے پروگرام اور کھلی سوالات والی تدریس ہوتی ہے، وہاں بچوں کی استدلالی صلاحیت، زبان اور خود اعتمادی میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فلسفۂ تعلیم ذہنی و فکری نشوونما کا نقشہ اور سمت فراہم کرتا ہے۔ یہ مقاصد واضح کر کے، تنقیدی سوچ اور استدلال کو فروغ دے کر، نصاب کو مرحلہ وار منظم کر کے اور استاد کو سوچنے والا پیشہ ور بنا کر بچے کے ذہن کو معلومات کے بوجھ سے نکال کر فکر کی ورزش میں لگاتا ہے۔ جس نظام میں فلسفہ غائب ہو وہاں تعلیم ڈگری اور ملازمت کی دوڑ بن جاتی ہے؛ جہاں فلسفہ زندہ ہو وہاں تعلیم انسان کو سوچنے والا، سوال کرنے والا اور درست فیصلے کرنے والا بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کی تربیت میں فلسفۂ تعلیم کو مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل رہنی چاہیے۔

سوال نمبر :2 تعلیم اور معاشرتی ترقی کا باہمی تعلق 20) نمبر(

سوال نمبر :2 تعلیم اور معاشرتی ترقی کے باہمی تعلق کا تجزیہ کریں۔(20)

تعارف

تعلیم اور معاشرتی ترقی کا تعلق انسانی تاریخ کے اہم ترین سوالات میں سے ایک ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی فہرست اور تعلیم یافتہ ممالک کی فہرست تقریباً ایک ہی ہے، اور یہ اتفاق نہیں بلکہ ایک گہرے سبب و نتیجے کے رشتے کی علامت ہے۔ لیکن یہ تعلق یک طرفہ نہیں :تعلیم معاشرے کو ترقی دیتی ہے اور ترقی یافتہ معاشرہ تعلیم کے لیے وسائل، ادارے اور سازگار ماحول پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں ایک چکر کی صورت میں ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں، اور جس معاشرے میں یہ چکر ٹوٹ جائے وہاں جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جواب میں تجزیہ کیا جائے گا کہ تعلیم کس طرح معاشی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے، معاشرہ کس طرح تعلیم کی نوعیت اور وسعت کا تعین کرتا ہے، اور پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے اس تجزیے کے عملی نتائج کیا ہیں۔

معاشرتی ترقی سے مراد صرف آمدنی میں اضافہ نہیں بلکہ زندگی کے معیار کی ہمہ جہت بہتری ہے :صحت، انصاف، امن، شعور، خواتین کی حیثیت، صفائی، سائنسی رویہ اور اداروں کی مضبوطی سب اس میں شامل ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا انسانی ترقی کا انڈیکس بھی تعلیم کو صحت اور آمدنی کے برابر تیسرا ستون قرار دیتا ہے۔ اس وسیع مفہوم کے ساتھ دیکھا جائے تو تعلیم ترقی کا ایک شعبہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہر دوسرے شعبے کی کارکردگی آخرکار انسانوں کی صلاحیت پر منحصر ہوتی ہے اور صلاحیت تعلیم ہی سے بنتی ہے۔

تعلیم معاشرتی ترقی کا محرک کیسے بنتی ہے؟

معاشی میدان میں تعلیم انسانی سرمایہ تیار کرتی ہے۔ پڑھا لکھا کسان جدید طریقے اپناتا ہے، تربیت یافتہ مزدور مشین کو بہتر چلاتا ہے، ماہر انجینئر اور مینیجر پیداوار بڑھاتے ہیں اور تعلیم یافتہ کاروباری نئے مواقع تلاش کرتا ہے۔ عالمی تحقیق بتاتی ہے کہ شرح خواندگی اور فی کس آمدنی کا گہرا ساتھ ہوتا ہے اور ایک اضافی سال کی تعلیم فرد کی آمدنی میں اوسطاً واضح اضافہ کرتی ہے۔ تعلیم غربت کے خاتمے کا بھی سب سے پائیدار ذریعہ ہے، کیونکہ یہ فرد کو صدقات کا محتاج رکھنے کے بجائے کمانے کے قابل بناتی ہے۔ خواتین کی تعلیم کے اثرات دور رس ہوتے ہیں :تعلیم یافتہ ماں بچوں کی صحت، غذائیت اور تعلیم کا بہتر اہتمام کرتی ہے، خاندان کا سائز متوازن رہتا ہے اور پوری نسل کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے؛ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک مرد کو تعلیم دینا ایک فرد کو تعلیم دینا ہے اور ایک عورت کو تعلیم دینا ایک خاندان کو۔

سماجی اور سیاسی میدان میں تعلیم شعور اور ذمہ داری پیدا کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ شہری اپنے حقوق و فرائض جانتا ہے، قانون کا احترام کرتا ہے، ووٹ سوچ سمجھ کر دیتا ہے اور بدعنوانی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے؛ یوں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ تعلیم تعصب، فرقہ واریت اور انتہا پسندی کو کم کرتی ہے کیونکہ یہ انسان کو دوسرے کی رائے سننے اور اختلاف کو برداشت کرنے کی تربیت دیتی ہے۔ صحت کے شعبے میں تعلیم کا کردار حیران کن ہے :پڑھی لکھی آبادی بیماریوں سے بچاؤ، صفائی اور علاج کی اہمیت سمجھتی ہے جس سے شرح اموات گھٹتی اور اوسط عمر بڑھتی ہے۔ ثقافتی میدان میں تعلیم زبان، ادب اور ورثے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ سائنسی رویہ بھی پیدا کرتی ہے جس سے معاشرہ توہمات سے نکل کر تحقیق کی طرف بڑھتا ہے۔ یوں تعلیم ترقی کے ہر پہلو کو بیک وقت آگے بڑھاتی ہے اور اسی لیے ترقی کے تمام عالمی اہداف میں تعلیم کو مرکزی درجہ دیا گیا ہے۔

معاشرہ تعلیم پر اثر انداز کیسے ہوتا ہے؟

تعلق کی دوسری سمت بھی اتنی ہی اہم ہے۔ معاشرہ تعلیم کے مقاصد، نصاب اور وسائل کا تعین کرتا ہے۔ ہر معاشرہ اپنے بچوں کو اپنی اقدار، زبان اور تاریخ سکھانا چاہتا ہے، اس لیے نصاب دراصل معاشرے کی خودکار تصویر ہوتی ہے۔ معاشرے کی معاشی حالت تعلیم کے بجٹ اور اسکولوں کی سہولتوں کو طے کرتی ہے؛ امیر معاشرے بہتر ادارے بناتے ہیں اور بہتر ادارے مزید ترقی لاتے ہیں، جب کہ غریب معاشرے اس چکر کو شروع کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ سماجی رویے بھی تعلیم کی وسعت کو محدود یا وسیع کرتے ہیں :جہاں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جائے وہاں آدھی آبادی نظام سے باہر رہ جاتی ہے، اور جہاں استاد کا احترام باقی ہو وہاں نوجوان تدریس کے پیشے کی طرف آتے ہیں۔

اس دوطرفہ تعلق سے ایک اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیمی اصلاح معاشرتی اصلاح کے بغیر ادھوری رہتی ہے اور معاشرتی تبدیلی تعلیم کے بغیر سطحی رہتی ہے۔ اگر اسکول میں ایمانداری پڑھائی جائے مگر معاشرے میں بدعنوان کامیاب نظر آئے تو بچہ اسکول کے سبق کو بھول جائے گا۔ اسی طرح اگر معاشرہ بدل بھی جائے مگر اسکول پرانا رٹہ نظام چلاتے رہیں تو نئی نسل نئے تقاضوں کے قابل نہیں بنے گی۔ پاکستان کے تناظر میں یہ تجزیہ خاصا اہم ہے :یہاں شرح خواندگی تقریباً ساٹھ فیصد کے لگ بھگ ہے، لاکھوں بچے اسکول سے باہر ہیں، تعلیم پر اخراجات قومی پیداوار کے دو فیصد کے آس پاس رہتے ہیں اور علاقائی و صنفی فرق واضح ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی علاقے میں تعلیم عام ہوئی وہاں صحت، روزگار اور سماجی شعور میں بہتری دیکھی گئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم کو اخراجات کے بجائے سرمایہ کاری سمجھا جائے، اساتذہ کی عزت و تربیت پر توجہ دی جائے اور معاشرے کے رسم و رواج میں جو چیزیں تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہیں ان کی اصلاح کے لیے علماء، میڈیا اور سماجی قیادت کو شامل کیا جائے۔

نتیجہ

تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ تعلیم اور معاشرتی ترقی لازم و ملزوم ہیں :تعلیم انسانی سرمایہ، شعور، صحت، جمہوریت اور معاشی پیداوار کے ذریعے معاشرے کو ترقی دیتی ہے، اور معاشرہ اپنے وسائل، اقدار اور رویوں کے ذریعے تعلیم کی وسعت و نوعیت متعین کرتا ہے۔ یہ تعلق چکر کی شکل میں چلتا ہے؛ اسے مثبت سمت میں گھمانا ہی قومی ترقی کی

کنجی ہے۔ پاکستان جیسے ملک کے لیے اس کا عملی مطلب یہ ہے کہ تعلیم کو قومی ترجیحات میں اولین مقام، مناسب بجٹ اور معاشرتی حمایت دی جائے، کیونکہ تعلیم میں لگایا گیا ہر روپیہ آنے والی دہائیوں میں کئی گنا ہو کر پورے معاشرے کو واپس ملتا ہے۔

سوال نمبر :3 پاکستان کے تعلیمی نظام میں مساوات اور معیار کے مسائل 20) نمبر(

سوال نمبر :3 پاکستان کے تعلیمی نظام میں مساوات اور معیار کے مسائل بیان کریں۔(20)

تعارف

کسی بھی تعلیمی نظام کی جانچ کے دو بڑے پیمانے مساوات اور معیار ہیں۔ مساوات کا مطلب ہے کہ ہر بچے کو، اس کے علاقے، جنس، زبان اور والدین کی آمدنی سے قطع نظر، تعلیم کے یکساں مواقع اور سہولتیں حاصل ہوں۔ معیار کا مطلب ہے کہ جو تعلیم دی جائے وہ واقعاً مفید ہو :بچہ پڑھنا لکھنا، سمجھنا، سوچنا اور عملی زندگی کی صلاحیتیں حاصل کرے۔ پاکستان کا آئین آرٹیکل 25-A کے تحت پانچ سے سولہ سال کے ہر بچے کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کو ریاست کی ذمہ داری قرار دیتا ہے، لیکن عملی صورت حال اس آئینی وعدے سے بہت پیچھے ہے۔ اس جواب میں پہلے مساوات کے مسائل بیان کیے جائیں گے، پھر معیار کے مسائل، اس کے بعد دونوں کے باہمی تعلق اور آخر میں بہتری کی سمت تجاویز پیش کی جائیں گی۔ یہ مسئلہ محض انتظامی نہیں، انصاف کا مسئلہ ہے، کیونکہ تعلیم سے محرومی آنے والی زندگی کی ہر محرومی کی جڑ بن جاتی ہے۔

مساوات کے مسائل

پاکستان میں مساوات کا سب سے بڑا مسئلہ اسکول سے باہر بچوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کی تعداد مختلف سرویز میں دو کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے؛ یہ بچے زیادہ تر غریب خاندانوں، دور دراز علاقوں اور کچی آبادیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ علاقائی فرق ہے :بڑے شہروں میں اسکول، استاد اور سہولتیں نسبتاً بہتر ہیں جب کہ دیہی علاقوں، خاص طور پر بلوچستان، اندرون سندھ، جنوبی پنجاب اور سابقہ قبائلی علاقوں میں اسکولوں کی کمی، اساتذہ کی غیر حاضری اور بنیادی سہولتوں کی عدم دستیابی عام ہے۔ تیسرا مسئلہ صنفی فرق ہے؛ لڑکیوں کی شرح خواندگی

اور ثانوی تعلیم تک رسائی لڑکوں سے واضح طور پر کم ہے جس کی وجوہات میں اسکول کا فاصلہ، خواتین اساتذہ کی کمی، حفاظتی خدشات اور سماجی رویے شامل ہیں۔

چوتھا اور ساختی مسئلہ متوازی تعلیمی نظاموں کا وجود ہے :مہنگے انگریزی میڈیم نجی اسکول، درمیانے نجی اسکول، سرکاری اردو میڈیم اسکول اور دینی مدارس ایک ہی معاشرے میں چار الگ ذہنی اور سماجی طبقات تیار کر رہے ہیں۔ بچے کا مستقبل اس کے ذہن سے زیادہ والدین کی جیب سے طے ہونے لگا ہے، جو مساوات کے اصول کی کھلی نفی ہے۔ پانچواں مسئلہ زبان کا ہے :مادری زبان سے مختلف ذریعۂ تعلیم سے غریب اور دیہی بچہ دوہری محرومی کا شکار ہوتا ہے، جب کہ امیر گھرانوں کے بچے گھر سے انگریزی کی مدد لے آتے ہیں۔ چھٹا مسئلہ خصوصی بچوں اور اقلیتوں کی تعلیم ہے جن کے لیے ادارے اور تربیت یافتہ اساتذہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان سب مسائل کا مجموعی اثر یہ ہے کہ تعلیم مساوات پیدا کرنے کے بجائے موجودہ طبقاتی تقسیم کو دوبارہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی جارہی ہے۔

معیار کے مسائل

معیار کے مسائل ان بچوں کو بھی متاثر کرتے ہیں جو اسکول کے اندر ہیں۔ آزاد جانچ پڑتال کی رپورٹیں بار بار بتاتی ہیں کہ پانچویں جماعت کے بہت سے بچے دوسری جماعت کی اردو یا انگریزی عبارت نہیں پڑھ سکتے اور اوسط درجے کے ریاضی کے سوالات نہیں کر سکتے، یعنی شمولیت کے ساتھ سیکھنے کا بحران بھی موجود ہے۔ اس کی پہلی وجہ اساتذہ کی تربیت اور تقرری کا نظام ہے :ماضی میں سفارش پر تقرریاں، کمزور تربیتی ادارے اور پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع کی کمی نے تدریسی معیار گرایا۔ دوسری وجہ نصاب اور امتحان کا باہمی تعلق ہے :امتحان یادداشت اور رٹے کو ناپتا ہے، اس لیے استاد بھی سمجھانے کے بجائے رٹوانے پر مجبور ہوتا ہے اور گائیڈوں و نوٹس کی صنعت پروان چڑھتی ہے۔ تیسری وجہ جسمانی سہولتیں ہیں :بہت سے اسکولوں میں پینے کا پانی، بیت الخلا، بجلی، فرنیچر اور کتب خانے میسر نہیں اور جماعتوں میں گنجائش سے زیادہ بچے بٹھائے جاتے ہیں۔

چوتھی وجہ گورننس اور نگرانی کی کمزوری ہے :فنڈز کا بروقت نہ ملنا، تعمیر و مرمت میں بدعنوانی، سیاسی مداخلت اور ڈیٹا کی عدم موجودگی میں پالیسی اندازوں پر بنتی ہے۔ پانچویں وجہ نصاب کی تجدید اور اساتذہ کی رہنمائی میں تسلسل کی کمی ہے؛ پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں اور ہر تبدیلی پچھلی کو ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔ چھٹی وجہ مادری زبان، اردو اور انگریزی کی کشمکش میں تدریسی وقت کا ضیاع اور بچے کے بنیادی تصورات کی کمزوری ہے۔ یہ مسائل مل

کر یہ صورت پیدا کرتے ہیں کہ بچہ سالہا سال اسکول میں رہ کر بھی وہ فہم و مہارت حاصل نہیں کر پاتا جو اس کے اگلے تعلیمی اور عملی مراحل کی بنیاد بنتی ہے۔

دونوں مسائل کا تعلق اور بہتری کی تجاویز

مساوات اور معیار ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جہاں مواقع غیر مساوی ہوں وہاں قومی معیار اوسطاً نیچے رہتا ہے، اور جہاں معیار گرا ہوا ہو وہاں امیر طبقہ نجی شعبے میں نکل جاتا ہے اور سرکاری نظام مزید نظر انداز ہوتا ہے۔ اس چکر کو توڑنے کے لیے چند تجاویز اہم ہیں۔ اول، اسکول سے باہر بچوں کے لیے اضافی وسائل اور لچک دار اوقات کے پروگرام دیے جائیں اور ہر ضلع کی سطح پر اندراج کی ذمہ داری متعین ہو۔ دوم، فنڈز کی تقسیم ضرورت کی بنیاد پر ہو :پسماندہ اضلاع اور لڑکیوں کے اسکولوں کو زیادہ وسائل ملنے چاہئیں تاکہ تاریخی فرق ختم ہو۔ سوم، اساتذہ کی تقرری مکمل میرٹ پر، تربیت جدید تدریسی طریقوں پر اور کارکردگی کا جائزہ کلاس روم کے مشاہدے سے ہو۔ چہارم، امتحانی نظام میں فہم، اطلاق اور تجزیے کے سوالات بڑھائے جائیں تاکہ رٹے کی حوصلہ شکنی ہو۔ پنجم، بنیادی سہولتوں کا کم از کم پیکج ہر اسکول میں یقینی بنایا جائے اور اس کی معلومات عوامی سطح پر شائع کی جائیں۔

ششم، ابتدائی جماعتوں میں مادری یا علاقائی زبان سے تدریجاً اردو و انگریزی کی طرف آنے کی وہ پالیسی اپنائی جائے جس پر جدید تحقیق اور قومی نصاب متفق ہیں۔ ہفتم، یکساں نصاب کی کوششوں کو اساتذہ کی تربیت اور سستی یکساں کتب کے بغیر نامکمل سمجھا جائے، کیونکہ نصاب کاغذ پر یکساں ہونے سے کلاس روم یکساں نہیں ہوتا۔ ہشتم، مقامی کمیونٹی اور والدین کو اسکول مینجمنٹ کمیٹیوں کے ذریعے شریک کیا جائے تاکہ نگرانی معاشرے کی سطح سے ہو۔ یہ تجاویز مہنگی ضرور ہیں لیکن تعلیم پر خرچ کو دنیا سرمایہ کاری اسی لیے کہتی ہے کہ اس کا منافع سب سے طویل اور سب سے وسیع ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کے تعلیمی نظام میں مساوات کے مسائل رسائی، علاقہ، جنس، زبان اور متوازی نظاموں کی شکل میں موجود ہیں اور معیار کے مسائل اساتذہ، نصاب و امتحان، سہولتوں اور گورننس کے شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بڑھاتے ہیں۔ آئینی وعدے اور عملی صورت کے فرق کو ختم کرنا ریاستی اداروں کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ اگر میرٹ، ضرورت مند کو ترجیح، اساتذہ کی عزت و تربیت اور جائزے کی

اصلاح کو پالیسی کا مرکز بنا لیا جائے تو پاکستان کا نظام بھی مساوات اور معیار دونوں میں بتدریج بہتری کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

سوال نمبر :4 غیر رسمی تعلیم کا دائرہ کار اور افادیت 20) نمبر(

سوال نمبر :4 غیر رسمی تعلیم کے دائرہ کار اور افادیت پر روشنی ڈالیں۔(20)

تعارف

ہر بچہ اور ہر نوجوان رسمی اسکول کی چار دیواری میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ غربت، مزدوری، فاصلہ، عمر کا گزر جانا یا گھریلو مجبوریاں لاکھوں انسانوں کو اس نظام سے باہر رکھتی ہیں۔ ایسے انسانوں کے لیے تعلیم کا جو متبادل اور لچک دار نظام وضع کیا گیا ہے اسے غیر رسمی تعلیم (Non-Formal Education) کہا جاتا ہے۔ یہ تعلیم منظم ضرور ہوتی ہے مگر رسمی نظام کی سختیوں سے آزاد ہوتی ہے :نہ اس کی عمر کی قید ہوتی ہے، نہ وردی اور حاضری کا وہی نظام، نہ سالانہ امتحان کی وہی بندش۔ اس جواب میں غیر رسمی تعلیم کا مفہوم اور رسمی و غیر رسمی (Informal)تعلیم سے اس کا فرق واضح کیا جائے گا، پھر اس کا وسیع دائرہ کار بیان ہوگا اور آخر میں اس کی افادیت و حدود کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

پاکستان جیسے ملک میں جہاں اسکول سے باہر بچوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور بالغ ناخواندگی بھی بڑی مقدار میں موجود ہے، غیر رسمی تعلیم کوئی اضافی سہولت نہیں بلکہ قومی ضرورت ہے۔ عالمی سطح پر بھی یونیسکو اور دیگر ادارے اسے رسمی نظام کے شانہ بشانہ ایک مکمل نظام کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ علی گڑھ سے لے کر جدید فاصلاتی نظام تک، اور کمیونٹی اسکولوں سے لے کر آن لائن مختصر کورسز تک، غیر رسمی تعلیم کی صورتیں وقت کے ساتھ پھیلتی رہی ہیں۔

مفہوم اور رسمی و دیگر اقسام سے فرق

غیر رسمی تعلیم سے مراد وہ منظم تعلیمی سرگرمیاں ہیں جو رسمی اسکول نظام سے باہر، مخصوص گروہوں کی ضروریات کے مطابق اور لچک دار انتظام کے تحت فراہم کی جائیں۔ رسمی تعلیم سے مراد وہ درجہ بند نظام ہے جو پرائمری سے یونیورسٹی تک چلتا ہے، جس میں داخلے کی عمر، نصاب، حاضری اور سند سب مقرر ہوتے ہیں۔ غیر

رسمی تعلیم (Informal Education) اس سے بھی مختلف ہے؛ وہ وہ غیر منصوبہ تعلیم ہے جو انسان زندگی بھر گھر، صحبت، میڈیا اور تجربے سے حاصل کرتا رہتا ہے جس کا نہ نصاب ہوتا ہے نہ استاد۔ غیر رسمی (Non-Formal) تعلیم ان دونوں کے درمیان ہے :منصوبہ بند بھی ہے مگر رسمی قیدوں سے آزاد بھی۔ اس فرق کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ غیر رسمی تعلیم کو معمولی یا غیر سنجیدہ سمجھنے کی غلطی نہ ہو؛ یہ باقاعدہ اہداف، نصاب اور تربیت یافتہ رضاکار یا استاد رکھتی ہے، صرف اس کا انتظام سیکھنے والے کی زندگی کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔

جدول :1 رسمی، غیر رسمی اور اتفاقی تعلیم کا فرق

پہلو	رسمی تعلیم	غیر رسمی تعلیم	اتفاقی تعلیم
مقام	اسکول، کالج، یونیورسٹی	کمیونٹی مرکز، گھر، فاصلاتی نظام	گھر، معاشرہ، میڈیا، تجربہ
نصاب و اوقات	مقرر اور سخت	منظم مگر لچک دار	کوئی مقرر نصاب نہیں
سند	باقاعدہ ڈگری و سرٹیفکیٹ	سرٹیفکیٹ، محدود قبولیت	کوئی سند نہیں
ہدف گروہ	مقررہ عمر کے طلبہ	محروم بچے، بالغان، خواتین، مزدور	ہر انسان زندگی بھر

غیر رسمی تعلیم کا دائرہ کار

غیر رسمی تعلیم کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ اس کا پہلا بڑا شعبہ خواندگی اور بنیادی تعلیم ہے :بالغان خواندگی کے مراکز، کمیونٹی اسکول، نان فارمل بیسک ایجوکیشن اسکول اور مسجد و گھریلو اسکول ان بچوں اور بڑوں کو پڑھنا لکھنا اور حساب سکھاتے ہیں جو رسمی اسکول سے محروم رہے۔ پاکستان میں صوبائی خواندگی محکمے، نیشنل کمیشن برائے انسانی ترقی اور متعدد فلاحی تنظیمیں اس میدان میں کام کرتی ہیں۔ دوسرا شعبہ فنی و پیشہ ورانہ تربیت ہے : سلائی کڑھائی، موٹر مکینک، بجلی کا کام، کمپیوٹر کے مختصر کورسز، موبائل مرمت اور دست کاری جیسی مہارتیں جو فوراً روزگار سے جڑتی ہیں۔ تیسرا شعبہ بالغان کی جاری تعلیم اور صحت و زراعت کی آگاہی ہے :ماں و بچے کی

صحت، صفائی، وباؤں سے بچاؤ، جدید کاشت کاری اور مویشیوں کی دیکھ بھال پر مبنی پروگرام دیہی زندگی میں فوری تبدیلی لاتے ہیں۔

چوتھا شعبہ فاصلاتی اور آزاد تعلیم ہے جس کی سب سے بڑی مثال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہے، جو کتابوں، ریڈیو، ٹیلی وژن اور اب ڈیجیٹل ذرائع سے ان لاکھوں لوگوں تک تعلیم پہنچاتی ہے جو کلاس روم میں نہیں آ سکتے، خصوصاً ملازمت پیشہ افراد اور گھریلو خواتین۔ پانچواں شعبہ خواتین کی تعلیم و تربیت ہے جہاں گھریلو مراکز میں خواندگی کے ساتھ صحت، بچوں کی پرورش اور آمدنی کے ہنر سکھائے جاتے ہیں۔ چھٹا شعبہ مذہبی و اخلاقی تعلیم اور نوجوانوں کی تربیت کے پروگرام ہیں، مثلاً اسکاؤٹنگ، کھیلوں کی تربیت اور سماجی خدمت کے منصوبے۔ ساتواں اور جدید شعبہ ڈیجیٹل خواندگی ہے :موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے مختصر ریڈیو اسباق اور مفت آن لائن کورسز نے غیر رسمی تعلیم کو وہ وسعت دی ہے جو پہلے ممکن نہ تھی۔ یوں یہ دائرہ پانچ سال کے بچے سے لے کر ساٹھ سال کے کسان تک ہر اس شخص کو گھیرتا ہے جسے علم یا ہنر کی ضرورت ہے مگر رسمی دروازہ اس کے لیے بند ہے۔

افادیت اور حدود

غیر رسمی تعلیم کی سب سے بڑی افادیت لچک ہے :اوقات سیکھنے والے کی مزدوری اور گھریلو ذمہ داریوں کے مطابق رکھے جاتے ہیں، جگہ مسجد، گھر، درخت کے سائے یا کمیونٹی ہال کچھ بھی ہو سکتی ہے اور داخلے کی کوئی عمری قید نہیں۔ دوسری افادیت کم لاگت ہے؛ بھاری عمارتوں اور بڑے عملے کے بغیر مقامی استاد اور مقامی وسائل سے تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے فی طالب علم خرچ رسمی نظام سے کئی گنا کم ہوتا ہے۔ تیسری افادیت ضرورت سے مطابقت ہے :نصاب سیکھنے والے کی زندگی سے جڑا ہوتا ہے، اس لیے دلچسپی اور حاضری زیادہ رہتی ہے؛ کسان کو حساب زرعی مثالوں سے اور ماں کو خواندگی صحت کی مثالوں سے سکھائی جاتی ہے۔ چوتھی افادیت دوسرا موقع ہے: یہ نظام ڈراپ آؤٹ بچوں، محنت کش بچوں اور ناخواندہ خواتین کو زندگی میں واپسی کا راستہ دیتا ہے اور انہیں رسمی نظام میں داخلے یا روزگار کے قابل بناتا ہے۔ پانچویں، یہ سماجی تبدیلی کا ذریعہ ہے :خواندہ ماں، صحت مند خاندان اور ہنر مند نوجوان پورے گاؤں کا ماحول بدل دیتے ہیں۔

تاہم اس کی حدود سے بھی آنکھ نہیں چرانی چاہیے۔ اس کے سرٹیفکیٹ کو رسمی اسناد کے برابر سماجی و سرکاری قبولیت حاصل نہیں، جس سے سیکھنے والے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ مقامی اساتذہ کی تربیت اور معاوضہ اکثر

کمزور ہوتا ہے۔ فنڈز کی عدم تسلسل سے بہت سے مراکز چند سال میں بند ہو جاتے ہیں۔ معیار کی نگرانی کا نظام بھی رسمی نظام جیسا مضبوط نہیں۔ ان حدود کا حل یہ ہے کہ غیر رسمی تعلیم کو مرکزی نظام سے جوڑا جائے :اس کے گریجویٹس کو مساوی امتحان دے کر رسمی جماعتوں میں داخلہ ملے، ان کے سرٹیفکیٹ کی سرکاری توثیق ہو، اساتذہ کی باقاعدہ تربیت اور مناسب معاوضہ ہو اور بجٹ میں اس کا مستقل حصہ رکھا جائے۔ اس طرح یہ نظام ثانوی متبادل کے بجائے رسمی نظام کا مضبوط بازو بن سکتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ غیر رسمی تعلیم کا دائرہ خواندگی، فنی تربیت، بالغان و خواتین کی تعلیم، فاصلاتی نظام اور ڈیجیٹل ذرائع تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی افادیت لچک، کم لاگت، ضرورت کے مطابقت اور دوسرے موقع کی فراہمی میں ہے۔ جس ملک میں رسمی نظام ساری آبادی تک نہ پہنچ سکتا ہو وہاں غیر رسمی تعلیم ہی وہ پل ہے جو محروم انسان کو علم و ہنر سے جوڑتا ہے۔ اگر اسے تسلسل، تربیت اور سرکاری توثیق دی جائے تو پاکستان کے خواندگی اور ہنر کے اہداف کے حصول میں یہ فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہے۔

سوال نمبر :5 قومی تعلیمی پالیسی کے مقاصد اور عملی نتائج کا جائزہ 20) نمبر(

سوال نمبر :5 قومی تعلیمی پالیسی کے مقاصد اور عملی نتائج کا جائزہ لیں۔(20)

تعارف

تعلیمی پالیسی کسی قوم کا وہ اعلانیہ راستہ ہے جس سے یہ طے ہوتا ہے کہ آنے والی نسل کو کیا پڑھایا جائے گا، کس زبان میں پڑھایا جائے گا، کتنا بجٹ ملے گا اور تعلیم کا تعلق قوم کے نظریے، معیشت اور ثقافت سے کیا ہوگا۔ پاکستان کی تاریخ میں قیام کے فوراً بعد 1947 کی تعلیمی کانفرنس سے لے کر آج تک متعدد تعلیمی پالیسیاں اور منصوبے آئے ہیں۔ ان پالیسیوں کے مقاصد کاغذ پر نہایت بلند و پُرکشش رہے ہیں :خواندگی کی عالمگیریت، اسلامی و قومی شناخت، سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی اور یکساں مواقع۔ مگر سوال یہ ہے کہ عملی نتائج ان مقاصد کے کس قدر قریب رہے؟ اس جواب میں پہلے تعلیمی پالیسی کا مفہوم و اہمیت، پھر اہم پالیسیوں کے مقاصد کا جائزہ، اس کے بعد عملی نتائج کا تجزیہ اور پالیسی و عمل کے فرق کی وجوہات بیان کی جائیں گی۔

تعلیمی پالیسیوں کے مقاصد کا جائزہ

1947کی پہلی تعلیمی کانفرنس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے خود کی اور ان کا پیغام آج بھی رہنما ہے کہ تعلیم کو قومی ضروریات سے ہم آہنگ کیا جائے، سائنسی و فنی تعلیم پر زور ہو اور طلبہ میں کردار و ذمہ داری پیدا کیا جائے۔ اس کانفرنس کے مقاصد میں مفت و لازمی پرائمری تعلیم، بالغان خواندگی اور اسلامی اقدار کا تحفظ شامل تھا۔ 1959کا شریف کمیشن، 1970 کی نور خان پالیسی، 1972 کی ذوالفقار علی بھٹو کے دور کی پالیسی) جس میں اداروں کی قومی ملکیت اور مفت تعلیم کا اعلان ہوا(، 1979 کی پالیسی) جس میں نظامِ مصطفیٰ کے تناظر میں اسلامائزیشن، مسجد اسکول اور اردو کو فروغ دینا شامل تھا(، 1992 اور 2001-1998 کی پالیسیاں، 2009 کی قومی تعلیمی پالیسی اور 2017 کی پالیسی — سب میں مشترک مقاصد کم و بیش یہی رہے :شرح خواندگی بڑھانا، پرائمری تعلیم کی تکمیل، معیار کی بہتری، اساتذہ کی تربیت، سائنس و ٹیکنالوجی اور فنی تعلیم کی توسیع، صنفی و علاقائی فرق کا خاتمہ اور نصاب کو قومی نظریے و جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا۔

مقاصد کے جائزے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ دباؤ بدلتا رہا۔ ابتدائی پالیسیوں کا زور شناخت اور توسیع پر تھا، بعد کی پالیسیوں میں معیار، گورننس اور عالمی اہداف) جیسے سب کے لیے تعلیم اور پائیدار ترقی کے اہداف (کا اضافہ ہوا۔ اٹھارویں آئینی ترمیم (2010) کے بعد تعلیم صوبوں کا موضوع بن گئی جس سے پالیسی سازی وکندریت ہوئی اور وفاقی سطح پر یکساں نصاب (Single National Curriculum) کی کوشش ایک نیا باب بن گئی۔ مقاصد کی سطح پر شاید ہی کوئی پالیسی کمزور کہی جا سکے؛ اصل مسئلہ ہمیشہ ان مقاصد کو اداروں، بجٹ اور نگرانی سے جوڑنے کا رہا ہے۔

عملی نتائج کا تجزیہ

عملی نتائج میں کامیابیاں بھی ہیں اور ناکامیاں بھی، اور دیانت دارانہ تجزیہ دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ کامیابیوں میں سب سے بڑی یہ ہے کہ 1947 میں چند لاکھ طلبہ اور قلیل اداروں سے شروع ہونے والا نظام آج لاکھوں اسکولوں، سیکڑوں جامعات اور کروڑوں طلبہ کا نظام بن چکا ہے؛ جامعات کی تعداد چند سے بڑھ کر دو سو سے زائد ہو گئی، خواتین کی تعلیم گاہوں میں شمولیت میں واضح اضافہ ہوا، شرح خواندگی تقریباً دس فیصد سے بڑھ کر تقریباً ساٹھ فیصد کے قریب پہنچی اور فنی و پیشہ ورانہ اداروں کا جال پھیلا۔ نجی شعبے اور غیر رسمی نظام نے بھی رسائی میں بڑا

حصہ ڈالا۔ میڈیکل، انجینئرنگ اور آئی ٹی کے شعبوں میں پاکستانی فارغ التحصیل دنیا بھر میں خدمات انجام دے رہے ہیں، جو نظام کی انفرادی سطح کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

دوسری طرف ناکامیاں زیادہ وزنی ہیں۔ تقریباً ہر پالیسی نے عالمگیر پرائمری تعلیم اور خواندگی کے اہداف مقررہ سال تک حاصل کرنے کا اعلان کیا اور تقریباً ہر ہدف ادھورا رہا؛ آج بھی دو کروڑ سے زیادہ بچے اسکول سے باہر ہیں اور بالغ خواندگی کا ہدف ستر سال سے پیچھے ح ، رہا ہے۔ تعلیم پر اخراجات کبھی بھی چار فیصد کے اعلان کردہ ہدف تک نہیں پہنچے اور عموماً دو فیصد کے آس پاس رہے۔ معیار وہ بحران ہے جس کا اعتراف اب سرکاری دستاویزات بھی کرتی ہیں۔ اداروں کی قومی ملکیت (1972) جیسی بڑی ن یلیاں بغیر تیاری کے آئیں اور بعد میں ان کا رخ الٹ دیا گیا جس سے نظام نے قیمتی برس کھوئے۔ اساتذہ کی سیاسی تقرر ں، ڈیٹا کے بغیر منصوبہ بندی اور نگرانی کی کمزوری نے بھی نتائج کو نقصان پہنچایا۔ سادہ الفاظ میں :پالیسیوں نے منزل درست بتائی مگر گاڑی کو ایندھن، ڈرائیور اور سڑک فراہم نہ کی گئی۔

پالیسی اور عمل کے فرق کی وجوہات اور نتیجہ

اس فرق کی وجوہات کا تجزیہ سبق آموز ہے۔ پہلی وجہ سیاسی و پالیسی عدم تسلسل ہے :ہر حکومت پچھلی پالیسی کو ادھورا چھوڑ کر نئی پالیسی لاتی رہی، حالانکہ تعلیمی نتائج دس پندرہ سال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ وسائل کی کمی اور ناقص خرچ ہے؛ اعلان کردہ بجٹ کا بھی پورا اور شفاف استعمال نہیں ہو سکا۔ تیسری وجہ عمل درآمد کے اداروں کی کمزوری ہے :ضلعی سطح کی انتظامیہ کے پاس نہ تربیت تھی نہ جواب دہی کا نظام۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ پالیسیاں بناتے وقت اساتذہ، والدین اور مقامی حقیقتوں کو شریک نہیں کیا گیا، اس لیے کاغذی اہداف زمینی حالات سے کٹے رہے۔ پانچویں وجہ امتحانی و تدریسی نظام کی اصلاح کا پالیسیوں میں اعلان تو ہونا مگر عملاً رٹے والے نظام کا برقرار رہنا ہے۔

ان وجوہات سے جو سبق نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایک اور پالیسی سے زیادہ ایک پالیسی پر عمل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے تعلیمی اہداف کو قانون و بجٹ سے باندھنا، کم از کم دو پالیسی ادوار تک تسلسل رکھنا، اساتذہ کی میرٹ تقرری و تربیت کو مرکز بنانا، ضلعی ڈیٹا کی بنیاد پر منصوبہ بندی اور نتائج کی آزاد جانچ کا نظام قائم کرنا

ضروری ہے۔ صوبائی خود مختاری کے بعد ہم آہنگی کا مؤثر وفاقی فورم بھی لازم ہے تاکہ قومی شناخت اور معیار یکساں رہیں۔

نتیجہ

مجموعی جائزہ یہ ہے کہ پاکستان کی تعلیمی پالیسیوں کے مقاصد ہمیشہ بلند اور درست رہے — خواندگی، شناخت، معیار، سائنس اور مساوات — اور عملی میدان میں توسیع و رسائی کی سطح پر حقیقی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ لیکن اہداف کی تکمیل، معیار اور مساوات کے میدان میں نتائج مقاصد سے بہت پیچھے ہیں، جس کی بنیادی وجوہات عدم تسلسل، کم بجٹ اور کمزور عمل درآمد ہیں۔ پالیسی کی کامیابی کا معیار اس کی خوبصورت عبارت نہیں بلکہ اسکول جانے والا ہر بچہ اور سیکھ کر نکلنے والا ہر طالب علم ہے۔ جب تک یہ معیار اپنایا نہیں جاتا، پالیسیاں دستاویزات میں اور مسائل زمین پر باقی رہیں گے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com